'قبضِ زماں' کا تنقیدی مطالعہ

نویدہ سلطانہ

مکان نمبر 949/76/61-1، نزد مسجد ہدیٰ، رحمت نگر، اولڈ جوارگی روڈ، کالابرگی۔585102، موبائل:9945879609

شمس الرحمٰن فاروقی کا نام دنیائے ادب میں اعتبار کا حامل ہے۔ان کو نہ صرف مشرقی ادب بلکہ مغربی ادب پر بھی دسترس حاصل ہے۔اس کے علاوہ شعریات اور زبان پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔انہیں قدیم وجدید تنقیدی رویوں سے پوری واقفیت حاصل ہے اور ساتھ ہی وہ اپنا ایک انفرادی نقطۂ نظر بھی رکھتے ہیں۔ان کی تحریروں سے ان کی دور اندیشی، علمیت، وسعتِ نظر، معلومات اور خود اعتمادی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اردو زبان کے بلند پایہ نقاد ہیں۔تنقید کے میدان میں ان کا قدم ایک اہم اضافہ ہے۔وہ ایک کامیاب ناول نگار بھی ہیں۔ناول کے میدان میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، لیکن انھوں نے اس قلیل عرصہ میں اپنی مہارت کا لوہا منوایا ہے۔انھوں نے ناول نگاری کے باب میں کم لکھا بہت خوب لکھا ہے۔ناول نگاری کے ادب پر ان کی جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان سے اردو ناول میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔اپنے ناولوں میں انھوں نے بہت سی فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ان کا اولین ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' اور دوسرا ناول ''قبضِ زماں'' کے نام سے اہلِ علم ودانش کو متاثر کیا ہے۔پروفیسر وہاب اشرفی اپنی کتاب ''معنیٰ کی تلاش'' میں شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''فاروقی کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی تحریر اس لیے نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوتی ہے جس سے ایک مکمل نظامِ فکر مرتب کیا جاسکتا ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی نے ناول ''قبضِ زماں'' میں زندگی کے متعدد مسائل کو تمثیلی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ان کے یہ فکر پارے ذہین قاری کے فکر کو مہمیز کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ فاروقی صاحب کی انفرادیت جدید دور کے ناول نگاروں میں مسلم ہے۔اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسے افکار ہیں جو ذہنوں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ناول کے ہر باب میں اس طرح کے مختلف واقعات تحریر کئے ہیں جن کی تشریحات قاری کو از خود کرنی ہوتی ہیں۔اس دوران قاری اپنی سوچوں میں گم ہو جاتا ہے۔ناول کے اول باب سے یہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

وہ دھوپ ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے، گرگٹ کا رنگ بدلنا، کھٹملوں کی وجہ سے نیند کا حرام ہونا، صبح جلد بیدار نہ ہونا، پیپل ونیم کا پیڑ، انگریز شاعروں کے عجیب نام جیسے Black Gray, Tiger, Snake, وغیرہ۔گڑھی کے جانوروں کا بھوت، پریت، برم بنا وغیر انسانوں کے مختلف طبقات کی نمائندگی تمثیلی انداز میں کی گئی ہے۔

وہ دھوپ ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے۔یہاں پر روزِ محشر کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔روزِ محشر میں نفسانفسی کا عالم ہوتا ہے۔ہر کوئی اپنے اپنے اعمال میں مصرف رہتا ہے۔گرمی کی تاب یعنی جہنم کی آگ کی طرف اشارہ ہے۔یعنی ماں اپنی اولاد کو بھی بھول جاتی ہے اور اپنی فکر میں مصروف رہتی ہے۔گرگٹ کا رنگ بدلنا یعنی موجودہ دور کے مخصوص انسانوں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے مفاد کے لیے برائی کی طرف مائل ہونے سے بھی نہیں چوکتا اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔کھٹمل کے ذریعے شمس الرحمٰن فاروقی نے طنز ومزاح سے قاری پر گہرے وار کئے ہیں۔ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''امریکہ کے بعض جنوبی شہروں میں ہندستان پاکستان کے لوگ ٹریفک پولیس والوں کو اسی لئے کھٹمل کہتے ہیں کہ خدا جانے کہاں سے بالکل اچانک برآمد ہو کر آپ کا پیچھا کرنے لگتے ہیں اور اگر ایک بار وہ آپ کے تعاقب میں لگ گئے تو آپ ان سے بچ نہیں سکتے۔وہ آپ کا چالان کر ہی کے چھوڑیں گے۔''

میرؔ نے بھی اپنے ایک شعر میں کھٹملوں کا ذکر کیا ہے۔جسے فاروقی صاحب نے اس شعر کو quote کیا ہے شعر ملاحظہ ہو:

آخرش شام سے ہو شب بیدار
کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار

اس اقتباس میں موجودہ حالات کے دو ممالک کی قوموں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔انگریزی نام دراصل نئی نسل میں جدید ناموں کے چلن کو بتلایا ہے۔پیپل اور نیم کے پیڑ گھنے اور سایہ دار ہوتے ہیں جو ہر لمحہ انسانوں

کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔پیپل ایک ایسا پیڑ ہے جو اپنی جڑ کٹ جانے پر بھی باقی رہتا ہے۔یہاں بھی جدید نسل کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔جووقت کے ساتھ بدل رہے ہیں اور والدین کا فریضہ بھول رہے ہیں۔رشتوں کی تقسیم میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔شریک حیات کو بیاہ کر اور اس کے گھر سے وداع کر کے لاتے ہیں اور والدین کو ان ہی کے گھر سے جدا کرتے ہیں۔والدین کی محبت اولاد کے لئے اسی پیپل کے سایہ دار درخت کی مانند ہے۔گھر سے جدا ہونے کے باوجود بھی ان کی محبت میں کمی نہیں آتی۔اس کے علاوہ نئی نسل رات دیر تک غیر ضروری کاموں میں مصروف رہ کر صبح دیر تک سوتی ہے اور فرائض کو بھول جاتی ہے۔اسی لیے علامہ اقبال نے کیا خواب کہا۔

کس قدر گراں تم پر صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے نیند تمھیں پیاری ہے

ناول ''قبضِ زماں'' کے ابتدائی اوراق کی ورق گردانی کی جائے تو یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ آپ بیتی ہے اور اس آپ بیتی کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے اس میں داستانوی رنگ کا تصور نمایاں ہوتا ہے۔ناول کے ہر باب میں فن کار نے ''در'' یا ''دریچے'' کی تصویر شائع کی ہے۔اس ناول کے مطالعہ سے پہلے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے ہر باب میں اپنی انفرادیت قائم کر رکھی ہے۔

ناول کے دوسرے باب میں شادی کا ذکر اور والد کے انتقال کے بعد جو مسائل درپیش آتے ہیں ان کا بیان ہے اور پھر اولاد کی پرورش اور شادی بیاہ کی فکر سے انسان کو کتنی پریشانیوں و تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے اس کا ذکر موجود ہے۔تیسرے باب میں طوائف امیر جاں کا ذکر ہے۔جو نہایت ہی سخی اور فیاض ہے۔اس حصہ سے ناول کی کہانی دلچسپ موڑ لیتی ہے۔طوائف جسے سماج بری نظر سے دیکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو موم بنا دیتا ہے۔آج ہمارے سماج میں سخاوت اور فیاضی نام کو بھی موجود نہیں۔اگر کوئی انسان کسی کی مدد بھی کرتا ہے تو بار بار احسان جتاتا ہے کہ فلاح کو میں نے اتنی رقم دی یا اس طرح مدد کی وغیرہ لیکن اس ناول کی طوائف اجنبی شخص کو پریشانی کے عالم میں دیکھ کر اس کی مدد کرتی ہے۔'گل محمد' جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔طوائف سے رقم لے کر اپنی بیٹی کی شادی کراتا ہے۔جب قرض کی واپسی پر طوائف کے گاؤں لوٹتا ہے تو امیر جاں کا انتقال ہو جاتا ہے۔قرض کی تلوار گل محمد کے سر ہوتی ہے تو وہ قبر پر فاتحہ درود کے لیے نکل پڑتا ہے۔وہاں پہنچ کر دیکھتا ہے کہ قبر شق ہو چکی ہے۔قبر کے اندر داخل ہوتا ہے امیر جاں عمدہ تخت پر بیٹھی ہے۔وہ دیکھ کر پریشان ہوتا ہے۔امیر جاں اس قبر سے نکل جانے کو کہتی ہے۔جب وہ قبر کے باغ کی طرف نظریں دوڑاتا ہے تو اس کا دل للچاتا ہے اور باغ کی سیر کو نکل پڑتا ہے۔سیر کر کے جب واپس دنیا میں لوٹتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔گل محمد کے لحاظ سے تین دن کا سفر صدیوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔اس واقعہ سے اصحابِ کہف کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے چنندہ بندوں کی بھلائی کے لئے وقت کو کوتاہ کر دیتا ہے اور انہیں ایسی گہری نیند سلا دیتا ہے کہ وہ دنیاوی خبر سے غافل ہو جاتے ہیں۔جب واپس غار سے نکلتے ہیں تو دنیا کے حالات ہی بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گل محمد امیر جاں کے قرض سے تو بری ہو جاتا ہے لیکن اپنا اصل فرض جو بیوی، ماں اور اولاد کا ہے وہ تین دن سے تین صدیوں کے طویل سفر میں منتقل ہو جاتا ہے۔انسان جب پریشانی کے عالم میں ہوتا ہے تو خود اس کے زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں ان کا حال اس ناول میں گل محمد کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

> ''مانا کہ یہ سب بے فائدہ، بے مزہ، بے صرفہ تھا۔یہ بات تو مجھے شروع ہی سے معلوم تھی کہ میرا کوئی نہیں ہے، گھر بھی نہیں ہے، اقارب بھی نہیں ہیں، سنگی ساتھی بھی نہیں ہیں، میں درحقیقت ایک جنات ہوں جو انسان کی جون میں زبردستی ڈال دیا گیا ہوں، لیکن پھر بھی میرے دل میں امید کا ایک تار سا معلق تھا کہ شاید....اس شاید کی جھونک ایسی تھی جو مجھے امید کے پالنے میں جھلائے جاتی تھی، چلو میری بی بی بیٹی بیٹا نہ ہوں گے، ان کے اعقاب تو ہوں گے۔سگے نہ ہوں گے رشتے کے تو ہوں گے۔کچھ نہ ہوگا تو میرا گاؤں تو ہوگا۔کوئی تو میری زمینوں کی کاشت کر رہا ہوگا۔میرا پرانا باغ سوکھ گیا ہوگا، دیمک کھا گئے ہوں گے لیکن اس کی جگہ نیا باغ تو کسی نے لگا لیا ہوگا۔اس میں پیپلے اور کونلیں تو کوکتی ہوں گی۔اس پر بارش کی پہلی پھوار سے گرد آلود آم کے پھلوں کا منھ تو اب بھی دھل جاتا ہوگا؟ لیکن عینی شاہد اور عقلی شاہد سب میرے خلاف تھے۔تو اب میں جی کر کیا کروں گا؟ خودکشی بھی تو کوئی بات ہے۔میر محمد علی اور میر عبدالحی میرے لیے گور و کفن تو مہیا کر ہی دیں گے، مگر خودکشی تو حرام ہے۔میری دادی کہتی تھیں خودکشی کرنے والا بدروح بن جاتا ہے...تو میں کیا کسی بدروح سے کم ہوں....؟''

گل محمد وقت اور حالات سے پریشان ہو کر موت کی تمنا کرتا ہے، لیکن اس کی یہ مراد پوری نہیں ہوتی۔اللہ کی عطا کردہ زندگی کو غنیمت جان کر حالات اور وقت سے سمجھوتا کر لیتا ہے۔ناول میں حیرت اس وقت ہوتی

ہے جب تخلیق کار آغاز میں ''میں'' کے کردار کے ذریعہ آبائی وطن کی سیر کراتا ہے۔ جب وہ پلنگ پر آرام کی غرض سے لیٹتا ہے تو کوئی اجنبی انسان اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور محو گفتگو ہوجاتا ہے۔ ناول سے ایک اقتباس پیش ہے:

''بندگی عرض کرتا ہوں حضور خان دوراں، عالی جاہ۔ مزاج سرکار کا کیسا ہے؟'' ''عجیب سی آواز تھی۔ کچھ کھوکھلی سی۔ لہجہ بھی ہماری طرف کا نہ تھا لیکن مغربی اضلاع والوں جیسا بھی تھا۔ لگتا تھا یہ شخص مدتوں فارسی بولنے والوں کے ساتھ یا آس پاس رہا ہو۔ پچھم والے ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ ایرانی، یعنی آج کے ایرانی، الفاظ کو تیزی سے ادا کرتے ہیں۔ اس شخص کی بھی ادائیگی ذرا تیز تھی۔ حرکات وسکنات بدن میں فدویانہ پن کے باوجود لہجے میں قوت اور سختی تھی۔ نیند کا ایک جھونکا آیا۔ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، ہوا بھی ٹھنڈی اور شیریں ہوگئی تھی۔''

شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ''قبضِ زماں'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی باب کو چھوڑ کر باقی ابواب میں خواب کے حالات کو بیان کیا ہے۔ یا پھر ان کا تخیل ہے یا پھر ماضی کے حالات۔ آٹھوں باب کے اختتامیہ پیش خدمت ہیں۔

''جیسے زلزلے کے جھٹکے نے میرا پلنگ زور سے ہلا دیا ہو، میں ہڑبڑا کر اٹھا اور پلنگ سے گرتے گرتے بچا۔''

''کیا کہا؟ سب مار لیے گئے؟ کوئی بھی نہ بچا؟''

''نہیں جناب۔ کوئی بھی نہیں۔'' اس نے پست اور افسردہ آواز میں کہا۔

''تو کیا... تو کیا تم مردہ ہو؟''

''یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا جناب۔ شاید آپ یہ معاملہ بہتر طے کر سکتے ہیں۔''

''افسردہ آواز اور بھی دھیمی پڑتی جارہی تھی۔ پھر جیسے بولنے والا دور ہوتا جارہا ہو۔''

''پھر شہنائی پر بھیروی کی نفیر دھیرے دھیرے اٹھی۔ وہ بھی دور ہوتی چلی گئی۔''

نویں باب میں ناول نگار نے میر عبدالحی تاباں کی شراب نوشی کا ذکر کیا اور ان کی موت کا حال بیان کیا ہے۔ اس ناول کی تبویب سے کچھ دیر کے لیے ڈرامے کا احساس ہوتا ہے۔ اس ناول کا اسلوب نرالا ہے۔ مختصر یہ کہ ناول کا ابتدائی باب بچپن کی حسین یادوں سے مزین ہے۔ جس میں ناول نگار نے ایسے الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا ہے جس سے شمس الرحمٰن فاروقی کی وسعت فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ ایک کامیاب نقاد ہیں۔ نقاد کی نظر میں بڑی گہرائی اور گیرائی بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق کے ساتھ تنقید اور تنقید کے ساتھ تحقیق کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بہترین صورت تو یہ ہے کہ محقق و نقاد دونوں ایک ہی ذات میں جمع ہوجائیں۔''

جمیل جالبی کا یہ قول شمس الرحمٰن فاروقی پر صادق آتا ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں دلی کے حالات اور شاعروں کی زندگی کو بھی تحقیقی انداز میں قلم بند کیا ہے کہ کس طرح دلی کا نام تبدیل کرتے ہوئے دہلی کیا گیا۔ اس کے علاوہ وہاں کے حالات، چاندنی چوک کے معاملات وغیرہ کا ذکر بھی اس ناول میں ملتا ہے۔ زبان کی صحت، روزمرہ اور محاورے کا برجستہ استعمال فارسی اقوال اور اشعار سے اس ناول کو مزین کیا گیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ''قبضِ زماں'' قول All that gliters are not gold کے مترادف لگتا ہے تو کبھی old is gold کے مماثل ہے۔ یہ ناول اپنی فنی خوبیوں کی بدولت اردو ناول کی دنیا میں اعلیٰ مثل ہے۔ سرورق سے ہی اس کی تحقیق وتنقید کا اندازہ ہوتا ہے۔ اکثر وبیشتر تخلیق کار اپنا نام عنوان کے بعد تحریر کرتے ہیں، مگر ناول نگار نے عنوان سے پہلے ہی اپنا نام درج کیا ہے۔ تخلیق کار نے یہ ناول سعادت حسن منٹو کی یاد میں خراج عقیدت کے طور پر فارسی شعر کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ابروے دیگراں نہ رسد ابروے ترا
ہر ماہ نومقدمہ و عیش عید نیست

''قبضِ زماں'' یعنی اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو بندے کے لیے زمانے کو پھیلا دیتا ہے اور وقت کو دراز کر دیتا ہے۔ جب کہ وہ دوسروں کے لیے بدستور کوتاہ رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی قبض زماں فرماتا ہے کہ زمانہ دراز کوتاہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی زمانے کو قید کرنا یا زمانے پر اپنا قبضہ جما کر زمانے کے حالات کو اپنے طور پر بدل دینا بھی خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ شاید یہی ''قبضِ زماں'' کا مفہوم معلوم ہوتا ہے۔

غرض شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ناول کو تحریر کر کے اپنی دانشوری کو استحکام پہنچایا ہے۔ دانشور وہی کہلاتا ہے جو اپنے علم ودانش کی مدد سے فطرت میں تسلسل، باقاعدگی، ہم آہنگی اور ارتقا کے اصول تلاش کر کے اپنے احساسِ جمال کے ذریعے نئے نئے تجربے کرتا ہے۔ ناول نگار نے اس ناول کے ذریعہ اردو ناول نگاری کو اعتبار بخشا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا نام اور ناول اپنی تمام تر خوبیوں کی بدولت اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کا باعث بھی ہے۔

○○